۶ ستمبر سے پہلے اور اس کے بعد

ڈاکٹر مس کنیز فاطمہ یوسف
ڈائریکٹر، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد

"غیر حل شدہ مسائل کو کسی طرح بھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مسئلے اس وقت تک بار بار ابھرتے رہتے ہیں جب تک کہ وہ کسی نہ کسی حد تک حل نہ ہو جائیں یا پھر اس معاشرے کو نیست و نابود نہ کر ڈالیں جو موثر طور پر ان کو حل کرنے میں ناکام رہا ہو۔"

یہ الفاظ مشہور برطانوی مورخ ٹوئن بی کے ہیں جو اس کی کتاب "مطالعہ تاریخ" کی پانچویں جلد کے صفحہ ۱۲-۱۳ پر درج ہیں۔ فلسفۂ تاریخ کے سلسلے میں یہی مورخ مزید لکھتا ہے۔

"تاریخ کا مطالعہ تہذیبوں کا مطالعہ ہے
تہذیب وہی قائم رہتی ہے جو وقت کے
چیلنج کا مثبت جواب دے سکتی ہو ورنہ اس کا
مٹ جانا یقینی ہے۔"

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی تاریخ ایک مسلسل کشمکش کی تاریخ ہے جس کے ہر دور میں یہ سوال پیدا ہوتا رہا کہ مسلمان ایک سیاسی گروہ کی حیثیت سے اس خطۂ زمین پر رہ بھی سکتے ہیں، یا نہیں؟ ۷۱۴ عیسوی میں جب سندھ سے محمد بن قاسم کو واپس دمشق بلوایا گیا تو یوں لگتا تھا کہ اسلام کا کارواں بھی اس سرزمین سے رخصت ہو جائے گا۔ اس زمانے میں ان ہزاروں لوگوں کو جو مسلمان ہو چکے تھے، ہندو ظلم و تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ان میں سے کئی ایک مرتد بھی ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود مسلم معاشرہ اس علاقے میں محفوظ رہا۔ آبادی کی اسی اکثریت کی بنا پر بعد میں سندھ کے علاقے کو بمبئی سے الگ کر کے علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا اور آخر کار یہ علاقہ پاکستان کا حصہ بنا۔

۱۰۰۰ عیسوی سے ۱۸۵۷ عیسوی تک کا زمانہ ترکوں اور مغلوں کا زمانہ ہے۔ مسلمانوں کا یہ دور مختلف خاندانوں کی حکومت کا دور کہلاتا ہے اس عرصے میں ہندوستان کے سیاسی حالات کچھ ایسے رہے کہ مسلمان حملہ آور مغرب سے ہندوستان آتے، پانی پت کے میدان میں فیصلہ کن لڑائیاں لڑتے اور شمالی ہند پر قابض ہونے کے بعد نئی حکومت کی بنیاد ڈال دیتے۔ پھر جو زیادہ ہوشمند اور طاقتور ہوتے وہ پورے جنوبی ہند تک تسلط جما لیتے۔ جب تک ان فرمانروا خاندانوں میں سیاسی اور جنگی قوت زندہ رہتی، ان کی حکومت استوار رہتی لیکن جوں ہی وہ عیش و عشرت کی طرف راغب ہوتے، داخلی معاملات میں ہلچل مچ جاتی، جا بجا بغاوتیں ہونے لگتیں، دبے ہوئے فتنے سر اٹھاتے، یہاں تک کہ حکومت کی کمزوری اور ملک کا سیاسی انتشار شمال سے مغرب سے آنے والے کسی نئے جانباز کو اکساتا اور حکومت کی باگ ڈور اس کے مضبوط ہاتھوں میں منتقل ہو جاتی اور یوں لوگوں کو ایک نیا حاکم مل جاتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ حکومت کی بے راہ روی سے تنگ آ کر لوگوں نے خود حملہ آوروں کو آنے کی دعوت دی تاکہ ابتری کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ رانا سانگا اور دولت خان لودھی نے مل کر بابر کو حملے کی دعوت دی۔ احمد شاہ ابدالی مسلمانوں کو مرہٹوں سے نجات دلانے کے لئے حملہ آور ہوا۔ فرق اتنا تھا کہ بابر نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور احمد شاہ ابدالی محض مرہٹوں کا زور توڑنے کے بعد واپس چلا گیا۔ اس وقت ہندوستان کو کسی مدبر اور طاقتور حکمران کی ضرورت تھی جو اسے نہ مل سکا۔ چنانچہ خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ فرانسیسیوں اور انگریزوں نے بھی، جو تاجروں کی حیثیت سے یہاں موجود تھے، ان خانہ جنگیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ جب ان دونوں کا تصادم ہوا تو فرانسیسیوں کو مات ہوئی اور ہندوستان انگریزوں کی ملکیت بن کے رہ گیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں مسلم عہد کی دو باتیں قابل غور ہیں۔ اول یہ کہ اگرچہ مسلمان اور ہندو ساتھ ساتھ رہے تاہم ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کو تمام کمال اپنے اندر مدغم نہ کر سکا۔ اس کی بہت

سی وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں اس کا سبب یہ تھا کہ ہندو سوسائٹی اس وقت تک فلسفہ و روایات کے اعتبار سے تو بہت ترقی کر چکی تھی مگر سیاست و ریاست کے میدان میں بہت پیچھے تھی۔ اس کے برعکس اسلام چونکہ اوائل ہی سے ثقافت اور سیاست و ریاست کا مجموعہ رہا ہے مسلم معاشرہ میں حکومت و فرمانروائی کی خاص صلاحیت موجود تھی۔ وہ غیر مذاہب کو پوری پوری مذہبی آزادی بھی دیتے ہیں۔ لہذا ہندوؤں نے ان کی ریاست و سیاست کو برداشت کر لیا نتیجے کے طور پر۔۔ سال تک ہندو اپنی تہذیب ثقافت کو سنبھالے رہے اور مسلمان حکومت کرتے رہے۔ مسلمانوں کو ہندو تہذیب، تہواروں اور رسموں کا ایک مجموعہ محسوس ہوتی تھی جسے وہ فراخدلی سے قبول کرتے رہے۔ دونوں کے راستے الگ الگ تھے لہذا عام طور پر وہ دو متوازی خطوط کی طرح اپنی اپنی راہ پر گامزن رہے۔ اگر کبھی ٹکراؤ ہوا بھی تو اس صورت میں کہ ہندو، مسلم ریاست اور انتظامیہ سے الجھتے یا مسلمان ہندو تہذیب میں دخل اندازی کرتے۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہتر سیاسی شعور اور فوجی صلاحیتوں سے حامل رہے جب ان کا یہ شعور اور یہ صلاحیت کمزور ہوتی تو ریاست کمزور ہو جاتی اور ریاست کے کمزور ہونے کے ساتھ ہی مسلمانوں کی بقا خطرے میں پڑ جاتی۔ اس خطرے کے پیش نظر ہندوستان کے مسلمانوں نے ہمیشہ دوسرے مسلم ممالک پر تکیہ کیا کہ کسی نہ کسی بیرونی طاقت کی مدد سے ریاست پھر سے قائم ہو جاتی اور مسلمان اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگتے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی بقا اور مسلم ریاست کی بقا ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم تھیں۔

انگریزوں کے تسلط کے بعد مسلمانوں کے لئے جداگانہ سیاسی حیثیت سے قائم رہنے کا مسئلہ بہت نازک صورت اختیار کر گیا۔ جب ریاست ہاتھ سے نکل گئی تو بحیثیت قوم مسلمان بے حد کمزور ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی لڑائی وقت کا بہت بڑا چیلنج تھی۔ مسلمان اس وقت اس کا کوئی موثر جواب دینے کی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ نتیجتہً ان کی مالی، تمدنی اور ثقافتی حیثیت بھی کمزور ہونے لگی۔ ویسے بھی انگریزوں نے چونکہ مسلمانوں سے ریاست حاصل کی تھی اس لئے وہ شروع ہی سے ان کو دبانا چاہتے تھے۔ لہذا انہوں نے جہاں مالی اعتبار سے مسلمانوں کے لیے بدحالی کے سامان پیدا کئے وہاں ہندو تہذیب کو نئی زندگی اور رواج دینے کے اسباب بھی مہیا کر دیے۔ بھگتی اور شدھی جیسی تحریکیں چلائی گئیں۔ اس پر طرہ یہ کہ طرز تعلیم بدلا گیا۔ انگریزی زبان رائج ہوئی اور مسلمان جو اپنے علم و ادب اور زبان کے ماہر تھے یکسر جاہل بن کے رہ گئے۔ اب ان کا سامنا ایک نئی حکومت ۔۔۔۔ سے تھا، ایک نئی تہذیب سے تھا، ایک نئے ادب سے تھا، ایک نئی زبان سے تھا لہذا ان کو کئی ایک محاذوں پر جنگ کرنی پڑی جس کے لیے وہ ہرگز تیار نہ تھے۔ سیاسی محاذ پر بادشاہت کی جگہ قومیت Nationalism اور دستوریت Constitutionalism نے لے لی۔ حق خود اختیاری اور جمہوریت بھی ان کے لیے نئے سبق تھے۔ ادھر نئی تعلیم، نے جو مغربیت کا سب سے زیادہ منضبط پروپیگنڈا تھی، مسلمانوں کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جہاں سے ابھرنا ان کے لیے ناممکن نظر آتا تھا۔ ہندو تو صدیوں سے بیرونی ریاست کو قبول کرنے کے عادی تھے۔ لہذا ان کو ان تمام تر دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑا جو مسلمانوں کو پیش آئیں۔ مسلمان حاکم بن کر رہنے کے خوگر تھے، محکوم بن کر کیسے رہتے؟ اور وہ جو اپنی تہذیب کو بہترین تہذیب سمجھتے تھے، کسی نئی تہذیب کو کیونکر اپنا سکتے تھے چنانچہ اس وقت مسلمان متعدد تضادات اور الجھنوں کا شکار ہو گئے اور انحطاط ان کی تقدیر بن گیا۔

اس کشمکش کے عالم میں مسلمانوں کو شاہ ولی اللہ ایسی شخصیت نے سہارا دیا۔ انہوں نے مسلم عصبیت کا قائم رکھنا مسلمانوں کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے لازمی سمجھا۔ انہوں نے تعلیم دی کہ مسلم سوسائٹی کا تشخص اس وقت تک قائم ہے جب تک ان میں اسلام باقی ہے۔ چنانچہ لادینی تہذیب اور عیسائیت کے ساتھ تصادم کی وجہ سے جو ذہنی انتشار پیدا ہو گیا تھا اس کو دور کرنے میں آپ کی مجتہدانہ کوششوں نے سرزمین پاک و ہند میں مسلمانوں کے وجود کو ختم ہونے سے بچا لیا۔ یہاں تک کہ سرسید نے اسلام میں اجتہاد کی ضرورت محسوس کی اور علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام ظہور میں آیا جسے پاکستان کے قیام کا پیش خیمہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

پہلی عالمگیر جنگ کے دوران مسلمانوں کو اپنی فوجی صلاحیت کو اجاگر کرنے کا موقع ملا۔ ہندوستانی فوجوں میں کیونکہ اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اس لیے اپنے کارہائے نمایاں کی بدولت مسلمانوں نے اپنی جداگانہ اہمیت

کو پھر ثابت کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ سر سید کی شروع کردہ تحریک بھی رنگ لا رہی تھی۔ چنانچہ آہستہ آہستہ مسلمانوں کی تعلیمی اور مالی حالت بھی سدھرنے لگی۔

اگرچہ اس کے بعد بھی انگریزوں کی یہ کوشش رہی کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں مگر یہ ادغام ناممکن ہی رہا۔ یہاں تک کہ یہ بات ان پر بھی الم نشرح ہو گئی کہ ہندو اور مسلمان مختلف تہذیبوں کے حامل ہیں اور ان کا فلسفۂ حیات ایک دوسرے سے اتنا مختلف ہے کہ ان کو یکجا کرنا فضول اور ناممکن ہے

دونوں تہذیبوں کی بنیاد مذہب تھے۔ چنانچہ ہندوستان میں تحریک آزادی جوں جوں زور پکڑتی گئی ہندو مسلم اختلاف بڑھتے گئے۔ تحریک خلافت نے جہاں ایک طرف یہ ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کا سیاسی شعور کسی نہ کسی رنگ میں ابھی تک زندہ ہے، وہاں دوسری طرف مسلمانوں نے یہ بات بھی محسوس کر لی کہ بیرونی مسلمان حکومتیں ہندوستانی مسلمانوں کی سرپرستی نہیں کر سکتیں لہٰذا اپنی بقا کے لیے آئندہ انہیں خود کوشش کرنی ہو گی۔ اسی احساس کے باعث پہلی بار ہندی مسلمانوں نے بیرونی مدد کے بغیر اپنی سوسائٹی میں اتحاد تنظیم اور ایمان کے جوہر پیدا کیے جن کی بنیاد پر آگے چل کر انہوں نے ایک مسلم ریاست قائم کر لی۔

یہ کہنا ٹھیک نہ ہوگا کہ ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ مسلمانوں میں ذہنی انتشار یکسر ختم ہو گیا تھا۔ مذہبی، ثقافتی، اقتصادی الجھنیں اب بھی بدستور باقی تھیں مگر اب مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ اسلامی تہذیب کے بقا اور ترقی کے لیے الگ ریاست کا قیام اشد ضروری ہے۔ اب چیلنج یہ تھا کہ قومیت کے نظریے کے تحت اکھنڈ بھارت میں مسلمانوں کا سیاسی وجود قائم رہے گا یا نہیں؟ فیصلہ یہ تھا کہ ایک ایسی اقلیت ہونے کی حیثیت سے، جو تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے ہندوؤں سے بہت پیچھے تھی، اکھنڈ بھارت میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا پاکستان بن گیا۔ مگر چھ ستمبر ۶۵ء کو پاکستان کے مسلمانوں نے اسی خطرے کو پھر سامنے پایا۔ ہندوستان نے بغیر اعلان جنگ کے حملہ کر کے مسلمانوں کی سیاسی اور ریاستی حیثیت کو ختم کرنا چاہا تھا۔ یہ چیلنج بار بار ہماری تاریخ میں دہرایا گیا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ وقتی طور پر اس چیلنج کا جواب دیا مگر اس کو ختم کرنے کی مکمل جدوجہد نہ کی، اس کا خاطر خواہ حل نہ تلاش کیا گیا۔ لہٰذا ہر منزل پر مسلمان پہنچ تو جاتے رہے مگر ہر تاریخی واقعہ ایک نئی الجھن پیدا کرتا رہا۔ چنانچہ جب پاکستان بنا تو بہت سی الجھنیں اسے ورثے میں ملیں منجملہ یہ کہ:۔

(۱) ہندوستان میں مسلمان ہر حصے میں پھیلے ہوئے تھے۔ پاکستان کا مطالبہ دس کروڑ مسلمانوں کا مطالبہ تھا۔ لیکن پاکستان بنا تو صرف چھ کروڑ مسلمانوں کے لئے بنا۔ بقیہ چار کروڑ مسلمان اسلامی مملکت سے محروم رہ گئے اور وہ اسی ظلم و تشدد کا شکار رہے جس سے بچنے کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا۔ ساتھ ہی یہ سوال بھی تشنہ رہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کیا ہو گی۔ جس کے نتیجے کے طور پر کسی وقت بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقسیم ہند مسلمانانِ ہند کے مسائل کا صحیح حل نہ تھا۔

(۲) پاکستان کی حدود مقرر کرتے وقت خدایان مغرب نے اس بات کا پورا پورا دھیان رکھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں کبھی حقیقی امن قائم نہ ہو سکے، کیونکہ دونوں کے مل جل کر رہنے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ مغربی طاقتوں کا اثر و رسوخ ان ملکوں سے بالکل ختم ہو جاتا۔ مغربی پاکستان میں دریاؤں کا مسئلہ اور کشمیر کا جھگڑا ان کی مکاری کے شاہد ہیں۔ ویسے تو مغربی ممالک میں بھی ہزاروں مرتبہ حد بندی کے مسائل پیدا ہوتے لیکن ان کو حل کر لیا گیا۔ جن اصولوں پر پاکستان کی سرحد بنائی گئی وہ اپنی نوعیت میں اس طرح منفرد تھے کہ آبادی کے تناسب کو بنیادی شرط تسلیم کرنے کے باوجود اس سے انحراف کیا گیا بلکہ من مانی حدود بنانے کے لیے آبادی کے "تناسب" کے یونٹ بھی ہر جگہ مختلف مقرر کیے گئے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں ہندوستان نے ایسے علاقے غصب کر لیے جو پاکستان کا حصہ تھے۔ چنانچہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصوں میں بھارت کے ساتھ سرحدی تنازعات آج تک ختم نہیں ہو پائے۔

(۳) پاکستان اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا۔ مغربی طاقتیں اسلام کو محض ایک مذہب سمجھتی ہیں۔ اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ سیاست اور مذہب کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجہ کینٹول سمتھ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بتائی ہے۔

"مغربی تہذیب واضح طور پر دو طرح کی روایات کا مجموعہ ہے جو کبھی ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہوئیں۔ ان روایات کا ایک حصہ یونان و روم کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اور دوسرا فلسطین کے ساتھ یہ دونوں طرح کی روایات ہمیشہ متوازی طور پر فروغ پاتی رہیں ان میں کبھی تصادم ہوا، کبھی ناگوار سا کھچاؤ وجود میں آیا، اور کبھی موافقت پیدا ہو گئی۔ لیکن وہ ایک دوسرے میں کبھی ضم

نہیں ہوئیں ۔" ۲؎

گویا جب قومیت کے سوا قوم کا کوئی اور نظریہ نہ ہو تو اسلامی مملکت کا تصور ایک نظریاتی مملکت ہونے کی وجہ سے مغرب میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا حالانکہ "اسرائیل" کے نام سے ایک خالصتاً مذہبی ریاست جنم لے چکی ہے جس کو وجود میں لانے میں مغربی طاقتوں نے دایہ کا کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ دنیا میں کئی نظریاتی ریاستیں بھی وجود میں آ چکی ہیں۔ اسلام بھی ایک نظریہ حیات ہے۔ اور اس کی بنیادوں پر ایک نظریاتی ریاست کا بن جانا کوئی عجیب بات نہ تھی لیکن مغربی ممالک نے ابھی تک پاکستان کو قبول نہیں کیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ صدیوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد جب مغربی تہذیب، اسلامی تہذیب پر حاوی ہو گئی تو اسلامی ریاستوں میں دوبارہ نظریاتی فروغ اہل مغرب کے لیے ایک نئے چیلنج کے مترادف تھا۔ لہٰذا وہ یہاں کسی نظریاتی ریاست، خاص طور پر اسلامی نظریے پر مبنی ریاست کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مگر ادھر اشتراکیت کا نظریہ بہت مقبول ہو رہا تھا اور جب دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کو مزید رواج حاصل ہو گیا تو مغربی اقوام جو جرمنی کو شکست دینے کے بعد اب سب سے زیادہ اس نظریے سے خائف تھیں، پاکستان کے نظریے کو محض اس لیے قبول کرنے پر رضامند ہو گئیں کہ اس کے وجود میں آ جانے کے بعد وہ اپنی تمام طاقتیں مجتمع کر کے اشتراکیت کے خلاف جنگ کر سکیں گی۔

(۴) تقسیم ہند کے بعد ہندوستان نے تو پارلیمانی جمہوریت قائم کر لی لیکن مسلمان اس سلسلے میں بھی ذہنی اور نظریاتی الجھن کا شکار ہو کے رہ گئے۔ دو صدیوں کی غلامی نے انہیں اسلامی طرز فکر تو کیا اسلامی شعائر سے بھی دور کر دیا تھا چنانچہ وہ اسلام کے تناظر میں جدید سیاسی اداروں کی تشکیل سے قاصر تھے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ سرسید جیسا کوئی مجتہد بھی ان میں موجود نہ تھا اور جس منزل کی نشاندہی اقبال نے کی تھی اس منزل کے متلاشی بھی زیادہ دیر ساتھ نہ دے سکے۔ لہٰذا کئی سال تک پاکستان کا دستور نہ بن سکا اور جب بنا بھی تو حکومت دو سال بعد جمہوریت سے آمریت بن چکی تھی۔ یہ مسئلہ اب تک ذہنی انتشار کا باعث ہے۔

(۵) پاکستانی تعلیمی اعتبار سے مغربی ممالک کا تو خیر کیا مقابلہ کرتے وہ ہندوستان سے بھی بہت پیچھے تھے غلامی کے دور میں جس احساس کمتری کا وہ شکار رہے تھے اس کے سبب وہ اپنی تاریخ سے بھی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ چنانچہ ریاست کو مضبوط کرنے والے اصولوں سے انحراف کرتے رہے۔ پاکستان مغربی مذہبی اصولوں سے متاثر تو تھا ہمارا نظامِ تعلیم، معاشی نظام اور سیاسی نظام بڑی حد تک مغربی تہذیب سے متاثر تھے تاہم پاکستان کے حاکموں نے مغربی اقتصادی نظام کو پوری طرح نہیں سمجھا اور وقت کے ساتھ پاکستان کی معیشت مغربی دنیا کی معیشت کی ایک کڑی بن گئی۔ اس طرح سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی پاکستان کو معاشی آزادی میسر نہیں آ سکی۔

(۶) پاکستانی قیادت امیر طبقے سے پیدا ہوئی تھی۔ امیروں کے مقابلے میں غریبوں کی وہی حیثیت تھی جو زمیندار کے مقابلے میں مزارع کی ہوتی ہے کہ بیگار کے بعد کسی مزدوری کا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لیڈر اور عوام ایک دوسرے کے قریب نہ آ سکے، ان کے نظریات میں ایک بعد قائم رہا۔ مغربی تعلیم سے بھی امیر طبقہ ہی آراستہ ہوا اور اسی طبقے کے ذہن میں اسلام سے بعد بھی پیدا ہوا۔ لہٰذا پاکستان کے امیر اور غریب طبقوں میں سیاسی شعور کی یہ بھی دو مختلف سطحیں وجود میں آئیں۔ امیر قومیت کا حامی ہے اور غریب اسلام کو اپنی تمام مشکلات کا حل سمجھتا ہے جس کے نام پر وہ ہر قسم کی قربانی کے لیے آمادہ نظر آتا ہے۔

مذکورہ بالا کمزوریوں کے باوجود بھی اگر پاکستان کو قائداعظم کے بعد ان جیسا کوئی مفکر، مدبر اور دیانت دار رہنما میسر آ جاتا تو شاید مسائل یوں نہ الجھتے نئے تصورات نئے وقت کا تقاضا ہوتے ہیں جو قوم یہ نئے تصورات پیدا نہیں کر سکتی پرانی رسموں اور عادتوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور بجائے ترقی کے انحطاط کی طرف چل دیتی ہے۔ یہی حال پاکستان کا ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد نظریۂ پاکستان کا مسئلہ بھی الجھا دیا گیا اور پاکستانیوں نے، خاص طور پر پاکستانی لیڈروں نے بیرونی تصورات اپنانے شروع کئے۔ بیرونی اثرات مسلمان حکومتیں تو دے نہ سکتی تھیں لہٰذا پاکستانیوں کی اس ضرورت کو مغربی اقوام نے پورا کیا جن کو اپنی صف آرائی کے لیے پاکستان کی ضرورت تھی۔

ادھر سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے دنیا کو سکیڑ دیا ہے۔ اس سکڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کے کسی ایک حصے کے حالات تمام دنیا کو متاثر کرنے لگے اور ایک ملک کا دوسرے ملک پر حملہ کرنا غیر اخلاقی گردانا جانے لگا۔ چنانچہ کھلم کھلا جنگ و جدل کی جگہ سرد جنگ نے لے لی۔ جنگی چالیں بھی بدل گئیں۔ سرد جنگ میں اقتصادی ترقی اور ملکی ثقافت سب سے زیادہ خطرناک مسئلے بن گئے۔ ترقی پذیر ممالک میں سیاسی سامراج کی جگہ اقتصادی سامراج قائم ہونے لگے اور اس سامراجیت کو قائم رکھنے کے لیے مخالف قوتیں عوام کو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر گمراہ کرنے لگیں۔ سرد جنگ کا ایک

ذہنی محاذ بھی ہے اور اس محاذ پر لڑنے کے لیے پاکستانیوں نے فی الحال سوچا بھی نہیں۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سرد جنگ میں روس اور امریکہ دو بڑی طاقتیں ابھریں۔ کوئی پندرہ سال بعد تیسری طاقت چین نے زور پکڑنا شروع کیا۔ جب تک روس اور امریکہ ایک دوسرے کے مدِمقابل تھے، نئی آزاد حکومتوں کو ایک خاص رعایت حاصل رہی کہ ان دونوں طاقتوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا اس عرصے میں غیر جانبدار ملکوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جو بین الاقوامی سیاست میں کافی اثر و رسوخ کا حامل بن گیا۔ یہ غیر جانبدار ملک وہ تھے جنہوں نے دوسری جنگ کے بعد آزادی حاصل کی تھی اور براعظم ایشیا اور افریقہ میں ان کی تعداد خاصی تھی۔ اس طرح ایک افریقی ایشیائی بلاک وجود میں آ گیا جس کی رسمی طور پر ابتدا ۱۹۵۴ء کی بینڈونگ کانفرنس میں ہوئی تھی۔ اس وقت اس میں مصر، انڈونیشیا، ہندوستان پیش پیش تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ چین ترقی کرتا گیا اور ایک ایشیائی ملک ہونے کی حیثیت سے اس نے افریقی ایشیائی بلاک کی تنظیم میں گہری دلچسپی لینی شروع کر دی۔ چین کی ترقی نے روس اور امریکہ کو ایک دوسرے کے قریب ہونے میں کافی تحریک دی۔ بین الاقوامی سیاست میں یہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی جس سے اب پوری دنیا متاثر ہو رہی ہے۔

امریکہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے ہنگری کی بغاوت کے بعد روس پر ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنی حدود سے باہر نہیں نکل سکتا اس لیے اب اس نے امن پسند ملکوں کے ساتھ مل کر زندہ رہنا سیکھ لیا ہے گالبریتھ کا ایک مضمون "ویت نام کی اہمیت" امریکہ کے محکمہ نشر و اشاعت نے تقسیم کیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ویت نام کی اہمیت ہنگری جیسی ہے۔ یعنی امریکہ چین کو بھی موجودہ حدود میں محصور ہونے پر مجبور کر کے پرامن طور پر رہنا سکھا سکتا ہے۔ چین کو یہ سبق سکھانے میں امریکہ کو اس لیے بھی جلدی ہے کہ چین عنقریب بحرالکاہل کی اہم طاقت بن جائے گا۔

روس ایک زمینی طاقت ہے۔ چین میں زمینی طاقت کے ساتھ سمندری طاقت بننے کی جغرافیائی اور تاریخی صلاحیتیں موجود ہیں۔ بحرالکاہل میں چین کی ترقی امریکہ کے لئے ایک چیلنج بن سکتی ہے۔ امریکی ثقافت میں نسلی امتیاز بھی اشتراکی نظریے کی مخالفت میں شدت پیدا کرتا رہا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے چین کے مقابلے میں بھارت کو جنوبی اور جنوب مغربی ایشیا میں سربرآوردہ طاقت بنانے کے لئے امریکہ نے منصوبہ بنایا ہے۔ "بھارت امریکہ دوستی" کی بنیادیں بھارت میں پہلے سے موجود تھیں۔

بھارت مغربی جمہوریت کا علمبردار تھا۔ اقتصادی نظام کے لحاظ سے طبقہ بندی ہندومت کا ایک لازمی جزو ہے، جس کی بنا پر سرمایہ داری ایک خاص طبقے کا اجارہ بن کر رہ جاتی ہے۔ مغرب کو سرمایہ داری نظام کا بیج بونے کے لیے بھارت سے زیادہ زرخیز زمین کہیں نہ مل سکتی تھی رقبے اور آبادی کے لحاظ سے بھی ایشیا میں بھارت ہی چین کا مدِمقابل ہے۔ لہٰذا امریکہ اور بھارت کا گٹھ جوڑ نہایت فطری بات تھی۔

امریکہ نے جب بھارت کی اقتصادی اور فوجی مدد کرنے کا فیصلہ کیا تو اپنے مزاج کے مطابق اس کے علمی اور ثقافتی پہلوؤں پر بھی غور کیا۔ امریکہ کے خیال میں ایشیائی فلسفہ ہندوستان کی فوجی ترقی میں حائل تھا۔ لہٰذا بھارت کا چین کو مدِمقابل بنانے کے لئے بھارتی فوج میں فوجی سپرٹ پیدا کرنے کی اشد ضرورت محسوس کی گئی۔ اس ضرورت کے تحت ۱۹۶۲ء میں چین بھارت جنگ کرائی گئی۔ مگر اس میں بھارتی فوج کا حوصلہ بجائے پروان چڑھنے کے اور بھی شکست خوردہ ہو گیا لہٰذا بھارت کا دل بڑھانے کے لیے اب ایک ایسی لڑائی کی ضرورت تھی جس میں واقعی وہ کامیاب ہو۔

اسی اثنا میں افریقی ایشیائی بلاک کی دوسری کانفرنس ۱۹۶۵ء میں الجزائر میں ہونی قرار پائی۔ اس میں چین، انڈونیشیا اور پاکستان پیش پیش نظر آ رہے تھے۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ اب اس بلاک کی قیادت چین کے ہاتھ آئے گی۔ یہ صورت حال مغربی طاقتوں کے لئے عموماً اور امریکہ کے لیے خصوصاً نہایت فکرمندی کا باعث تھی۔ اس بلاک کا فیصلہ کہ روس کو اس بلاک کا ممبر نہ بنایا جائے، اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا۔ امریکہ اس بلاک میں روس کی قیادت برداشت کر سکتا تھا مگر چین کی قیادت کا مطلب یہ تھا کہ افریقہ اور ایشیا متحد ہونے پر دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن جائیں گے اور چین کی قیادت میں امریکہ سے اس طرح کی سمجھوتہ بازی کرنے پر رضامند نہ ہوں گے جیسی سمجھوتہ بازی اب روس کر چکا ہے۔ چنانچہ ایک فوجی بغاوت کے ذریعے الجزائر کانفرنس ملتوی کرائی گئی اور اس کے بعد افریقی ایشیائی ملکوں میں یکے بعد دیگرے انقلاب آنے شروع ہوئے۔ یہ انقلاب ان ملکوں میں آئے جو الجزائر کانفرنس میں پیش پیش تھے اور ایک حد تک سوشلزم کے مداح تھے۔ اس سلسلے میں انڈونیشیا کی مثال سب سے نمایاں ہے۔

پاکستان کی فضا اس کے لیے زیادہ سازگار ثابت نہ ہوئی۔ مغربی پاکستان تو اس لحاظ سے بہت سرد ہے۔ مشرقی پاکستان میں انقلابی رجحانات ضرور ہیں مگر امریکہ کی انتہائی کوشش کے باوجود وہاں کے لوگ کسی ایسے

انقلاب کے لیے تیار نہ ہوئے جو امریکہ چاہتا تھا۔ اب امریکہ کے لیے ایک ہی راستہ تھا جس سے وہ اپنا مطلب حاصل کر سکتا تھا اور وہ تھا پاکستان اور بھارت میں جنگ۔ پاکستانیوں کو یہ بات بالکل صاف طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ ۶ ستمبر کی جنگ پاکستان نے اپنی مرضی سے نہیں لڑی۔ یہ ان افریقی ایشیائی انقلابات کی زنجیر کی ایک کڑی تھی جو امریکہ کی حمایت میں برپا ہوئے۔

یہاں دو باتیں واضح کرنا ضروری ہیں۔ اول یہ کہ پاک بھارت جنگ سے امریکہ کیا چاہتا تھا جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے امریکہ چاہتا تھا کہ بھارت جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا میں ایشیائی جمہوریتوں کا لیڈر بن جائے۔ اس پوزیشن کے حصول میں اگر اسے چین سے جنگ کرنی پڑے تو وہ دو علاقوں میں ہو سکتی تھی۔ چین چونکہ ابھی سمندری طاقت نہیں بنا لہٰذا یہ دو علاقے نیفا اور لداخ ہیں۔ یہ علاقے بھارت کے قبضے میں ہیں مگر دونوں کے ساتھ ایک ایک مسئلہ پاکستان کے وجود نے منسلک کر رکھا ہے۔ نیفا میں لڑائی کی صورت میں یہ ضروری ہے کہ مغربی بنگال کے صنعتی علاقے سے اس کا تعلق ایسا ہو کہ جنگی سامان کم سے کم عرصے میں وہاں پہنچ سکے۔ یہ راستے مشرقی پاکستان سے ہو کر گزرتے ہیں امریکہ کے لیے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ کسی طرح مشرقی پاکستان یہ راستے بھارت کے لیے کھول دے۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں ثقافت اور زبان کے مسائل کو طرح طرح کے رنگوں میں پیش کیا گیا کہ مشرقی پاکستان کسی طرح مغربی پاکستان سے الگ ہو جائے۔ مگر امریکہ کو اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ یہ کامیابی وہ پاک بھارت جنگ کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

دوسرے یہ کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ باقی ہے بھارت اور پاکستان میں کسی وقت بھی جنگ چھڑ سکتی ہے۔ اگر کسی طرح کشمیر کا ٹنٹا ختم ہو جائے تو مشترکہ دفاع کا منصوبہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ پاکستانی ہندوؤں میں مشترکہ دفاع کا تصور فطری طور پر موجود تھا۔ اس میں بھارت کا کوئی نقصان نہیں تھا۔ کیونکہ ایسی صورت میں تمام سینئر عہدے بھارت کو ملتے۔

اس تصور کو عوام تک پہنچانے کے لیے بھارت اور پاکستان میں ایک جنگ لازمی تھی جس میں پاکستان شکست کھا جائے اور پھر اس پر مشترکہ دفاع ٹھونس دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس فتح سے بھارتی فوج کا حوصلہ اتنا بڑھ جاتا کہ ضرورت کے وقت وہ چین سے ٹکر لینے پر تیار ہو جاتی۔

تیسرے یہ کہ امریکہ نے افریقی ایشیائی ممالک میں ان لیڈروں کو بھی غیر مقبول یا غیر موثر بنانے کی کوشش کی جو سوشلزم کے حامی اور چینی قیادت کو کسی حد تک قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ اگر جنگ میں پاکستان ہار جاتا تو اس کے وہ لیڈر جنہوں نے نئی خارجہ پالیسی اپنائی تھی غیر مقبول ہو سکتے تھے۔ لہٰذا ایک پاک بھارت جنگ ناگزیر تھی۔

اس سلسلے میں غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم لڑنا نہیں چاہتے تھے تو پھر جنگ کیسے شروع ہو گئی۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے چند افواہوں کا تجزیہ لازمی ہے۔ پہلی افواہ یہ تھی کہ جنگ اس لیے بند کر دی گئی کہ پاکستان کے پاس کافی فوج نہ تھی بلکہ سامان جنگ بھی ناکافی تھا۔ دانشوروں کے ایک اجتماع میں خود ہمارے رہنما نے یہ فرمایا تھا کہ پاکستان اقتصادی لحاظ سے اتنا پسماندہ ملک ہے کہ اگر فیصلہ کن لڑائی کی تیاری کی جائے تو عوام کے کرتے پاجامے بھی بک جائیں۔

دوسری افواہ محکمہ دفاع اور دفتر خارجہ کے بیانوں کے تضاد کے بارے میں ہے۔ اس کے مطابق محکمہ دفاع کہتا ہے کہ دفتر خارجہ نے ان کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان کی سرحد پر کسی قسم کا حملہ نہیں ہو گا۔ اس لیے لاہور پر حملہ اچانک اور پاکستانی افواج کے لیے باعث تعجب تھا۔

دفاع کے محکمے کے لیے تو جواب سیدھا سادا ہے کہ دفاع کا مطلب دشمن کی صلاحیت کے مطابق ہر وقت مستعد رہنا ہوتا ہے۔ اگر ہم تیار نہ تھے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم واقعی لڑنا نہیں چاہتے تھے۔

لہٰذا کشمیر میں جنگ شروع ہو گئی اور ایک ماہ سے کم عرصے کی لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھ ستمبر کو لاہور پر بھارتی حملے کی وجہ سے پاکستان کی تمام تر آبادی جنگ کی لپیٹ میں آ گئی۔

ملکی اور غیر ملکی جنگی تبصروں سے پتہ چلتا ہے کہ ، استمبر کے بعد ہندوستان میں جنگ جاری رکھنے کی ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ ، استمبر سے بھارت نے جنگ بندی کے لیے چلانا شروع کر دیا۔ اب امریکہ کے لیے یہ مسئلہ تھا کہ اگر جنگ جاری رکھی جائے تو کیسے؟ اس کے خیال میں اس جنگ میں ہندوستان کو فتح ہونی چاہیے تھی۔ بھارت کی فتح کے بغیر پاک و ہند کے مسائل کا حل امریکہ کی منطق میں ٹھیک نہ بیٹھتا تھا۔ پھر الجزائر سے لے کر انڈونیشیا تک امریکہ اپنی پالیسی میں کامیاب ہی کامیاب رہا۔ اب اگر پاکستان جنگ جیت جاتا تو گویا امریکہ کے عزائم ملیامیٹ ہو جاتے۔ جیسے پہلے جنگ شروع کروانی ضروری تھی اب جنگ بندی لازمی ہو گئی۔ اگرچہ بیرونی مبصروں نے کافی زور لگایا کہ ہندوستان لڑائی جاری رکھے انہوں نے بھارت کا حوصلہ بڑھانے کے لیے تبصرے کیے کہ جب پاکستان کا

جنگی سامان ختم ہوجائے گا، تو لڑائی صرف پیادہ فوج کی رہ جائے گی، اس میں ہندوستان سے پاس کارخانے ہیں، افرادی قوت ہے لہٰذا فوراً جیت جائے گا۔ مگر سترہ دن کی لڑائی کے بعد ہندوستان مزید لڑنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا لہذا جنگ بندی ہوگئی۔

اب اگرچہ نہ ہندوستان جیتا نہ پاکستان مگر کسی نہ کسی طرح بھارت فتح یاب دکھائی ضرور دیتا تھا۔ امریکہ جو مقاصد پاکستان کی شکست کے بعد حاصل کرنا چاہتا تھا وہ امریکہ کے لئے اب بھی اہم تھے۔ چنانچہ فوجی جنگ اب نفسیاتی جنگ بن گئی۔ پاکستان کو یقین دلایا گیا کہ پاکستان کو شکست ہوگئی ہے۔ دلیل یہ تھی کہ پاکستان کو ختم کرنے کے لئے جنگ نہیں لڑی گئی تھی۔ وہ صرف کشمیر سے پاکستان کی توجہ ہٹانے کے لیے لاہور پر حملہ کیا گیا تھا اور اس مقصد میں ہندوستان کامیاب رہا، ادھر پاکستان کشمیر کو بزورِ شمشیر لینا چاہتا تھا اور اس میں ناکام رہا اس لیے اس کو شکست ہو گئی ہے۔

اس جنگ بندی میں روس نے امریکہ کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ روس کا کہنا ہے کہ ہندوستان ایک بڑا ملک ہے، اور وہ اسے امریکہ کے تسلط کے لیے کھلا نہیں چھوڑ سکتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر پاکستان اور بھارت کی جنگ جاری رہتی تو چین پاکستان کی مدد کرنے کو تیار تھا، اور چین پاکستان کی مدد کرتا تو امریکہ بھارت کی مدد ضرور کرتا، ان حالات میں اگر روس چین کی مدد کرتا تو چین بہت بڑی طاقت بن جاتا اور سوشلسٹ ممالک کی قیادت چین کے ہاتھ میں چلی جاتی۔ یہ بات روس قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ دوسری طرف اگر روس، امریکہ کے ساتھ ہندوستان کی مدد کرتا تو کمیونسٹ بلاک کی پھوٹ مزید ظاہر ہو جاتی اور اس سے امریکہ بہت سے فوائد حاصل کرتا۔ لہٰذا روس نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اس مخمصے سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بھارت اور پاکستان کے مابین جنگ بند ہوجائے۔

اس صورت حال سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ جنگ افریقی ایشیائی بلاک کو ختم کرنے ہی کی ایک کڑی تھی۔ ہم نہ تیار تھے، نہ لڑنا چاہتے تھے۔ لہٰذا ہم نے بہترین سپاہیانہ خصوصیات رکھتے ہوئے بھی جنگ بندی کے بعد ایسی ایسی شرائط پر معاہدے کیے جو شکست خوردہ قوموں کا مقدر ہوتے ہیں۔

امریکہ اور روس کی جنوبی ایشیائی پالیسی تقریباً ایک ہی ہے۔ مگر چین کی پالیسی مختلف ہے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ چین ہندوستان کی برتری کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ بات امریکہ کو بھی معلوم ہے مگر دونوں کے لائحہ عمل میں فرق ہے۔ چین کے نزدیک پاک بھارت تنازع کے بڑھنے کے یہی فائدے تھے کہ ایک تو ویت نام پر امریکہ کا زور کم پڑ جاتا، دوسرے ہندوستان کمزور ہو جاتا یہاں تک کہ چند سال کے لیے وہ چین کے مقابلے کی تیاری میں سست پڑ جاتا جس سے طاقت کا توازن چین کے حق میں مزید جھک جاتا۔ پھر جنگ اگر طوالت پکڑتی تو پاکستان میں سوشلزم نسبتاً جلدی آ جاتا۔ جنگ کے دوران میں اگر قیادت نااہل ہو تو انقلاب ایک لازمی امر بن جاتا ہے بلکہ انقلابی لیڈروں کا کہنا ہے کہ انقلاب کے لیے زمین تیار ہونے کے باوجود انقلاب چھوٹنے کے لیے جنگ یا قحط دونوں وہی کام کرتے ہیں جو پستول چلانے کے عمل میں لبلبی دبانا کرتا ہے۔ روس، چین، ترکی جیسے ملکوں کے چھوٹے بڑے انقلاب جنگ ہی سے پیدا ہوئے اور جنگ کے دوران ہی میں پروان چڑھے۔ پاکستان کے سوشلسٹ ہو جانے کے بعد ہندوستان کی پرانی تاریخ دہرانے میں کوئی خاص دقت پیش نہ آتی۔ یہ صورتحال جنگ سے نہ ابھرتی تو اندرون انقلاب سے ابھرتی کیونکہ چین کے خیال میں پاکستان کا چھوٹا سا ملک اپنے سے پانچ گنا بڑے ملک ہندوستان کو شکست نہ بھی دے سکتا تو بھی کشمیر کو آزاد کرا سکتا تھا۔ اور اس صورت میں دبی ہوئی آزادی کی تحریکیں زور پکڑ لیتیں اور ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اتنا کمزور ہو جاتا کہ اسے پھر صرف سوشلزم ہی بچا سکتا تھا۔ مگر اس چینی تجزیے کا علم امریکہ اور روس کو بھی ضرور ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے پاکستان کا پلڑا بھاری دیکھ کر جنگ بندی کی کوشش کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی شروع کر دی کہ پاکستان میں مستقبل قریب میں کسی نئی جنگ کا چیلنج قبول کرنے کی استطاعت ہی نہ رہے۔ اس کوشش کا نام ہے معاہدۂ تاشقند۔ معاہدۂ تاشقند کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس میں کئی باتیں پریشان کرنے والی ہیں۔

۱۹۶۵ء میں پاکستان نے جنگ کے دو چیلنج قبول کیے تھے ایک رن آف کچھ میں دوسرا لاہور کے محاذ پر۔ دونوں میں پاکستانی افواج کی کارکردگی بھارتی افواج سے کہیں بہتر تھی جو بھارت کی قیادت کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھا اور امریکہ کے نظریے کے مطابق جلد از جلد اس کا خاتمہ ضروری تھا۔

معاہدۂ تاشقند کی پہلی شق یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے سربراہوں نے یہ محسوس کیا کہ برصغیر میں عوام کی بھلائی اس میں ہے کہ

اس خطے میں لڑائی نہ ہو۔ دونوں ملکوں کے درمیان کسی قسم کی کشمکش، لڑائی کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ کشمیر کے مسئلے پر دونوں ملکوں نے اس پس منظر پر غور کیا چنانچہ طے پایا کہ اس کے حل کے لیے لڑائی کے بجائے گفت و شنید کو ترجیح دی جائے گی۔ گویا پاکستان کشمیر یا کسی اور مسئلے کے حل کے لیے طاقت استعمال نہیں کرے گا۔ اگر طاقت کا استعمال غیر اخلاقی بنا دیا جائے تو کشمیر کے مسئلے کا ایک ہی حل رہ جاتا ہے کہ دونوں ملک موجودہ خط متارکہ کو پاکستان اور بھارت کی سرحد مان لیں۔ اس میں چند خطرے ہیں۔

ایک تو یہ کہ جس طرح کشمیر کے آزاد ہو جانے سے ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خطرہ ہے، اسی طرح کشمیر کے مسئلے کو ہندوستانی طریقے سے حل کرنے میں پاکستان کی سالمیت خطرے میں ہے۔ اسے قبول کرنے سے پاکستان کا نظریہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں رہ سکتے ہیں تو باقی چھ کروڑ کیوں نہیں رہ سکتے، جبکہ بھارت ایک سیکولر حکومت بھی ہے۔

دوسرے ایک خط متارکہ کو سرحد مان لیا جائے تو اس کا بالواسطہ مطلب یہ بھی ہوگا کہ پاکستان نے کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق مان لیا ہے۔ اس وقت بھارت ایک قانونی مسئلہ چھیڑ سکتا ہے کہ اگر الحاق جائز ہے تو آزاد کشمیر کس طرح پاکستان کا حصّہ ہے۔ پھر اس مسئلے کے اور بھی کئی شاخسانے ہو سکتے ہیں۔

بھارت کو دو چیزوں کی تیاری کرنے کے بعد پاکستان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ ایک تو وہ اپنی افواج اور بڑھائے تاکہ تناسب ایک اور پانچ کی بجائے ایک اور سات یا اس سے زیادہ کا ہو جائے۔ پھر رن آف کچھ جیسے مسائل کو پاکستان چیلنج نہیں سمجھے گا بلکہ فوجی برتری کی بنا پر ہندوستان جو کہے گا اسے ماننا پڑے گا۔ دوسرے وہ پاکستان پر اقتصادی برتری حاصل کر لے۔ جس طرح چین ہندوستانی مارکیٹ کو جنوب مشرقی ایشیا میں خراب کرتا ہے اسی طرح پاکستان جنوب مغربی ایشیا میں گڑبڑ کرتا ہے۔ اگر پاکستان اور ہندوستان کسی طرح کے ”مشترکہ اقتصادی منصوبوں“ کے چکر میں پھنس جائیں تو بھارت کے لیے پاکستانی اقتصادی چیلنج بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا معاہدۂ تاشقند کی ایک شق یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے وزیر اعظم اور صدر پاکستان نے مان لیا کہ وہ ایسے طریقوں کے بارے میں غور کریں گے جو دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی تعلقات بحال کر سکیں گے، ساتھ ہی ذرائع نقل و حمل سے اور ثقافتی تعلقات کی بحالی کے سلسلے میں بھی دونوں ملک پہلے کیے ہوئے معاہدوں پر عملدرآمد کریں گے۔

مختصراً یہ کہ امریکہ پاک بھارت جنگ سے یہ چاہتا تھا کہ پاکستان کی فوجی طاقت کم ہو جائے اور جو کچھ تیاری امریکی ہتھیاروں نے پاکستانی افواج میں پیدا کر دی تھی، وہ ختم ہو جائے تاکہ پاکستان ہندوستان کی برتری کو تسلیم کر لے ساتھ ہی دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی تعاون کی داغ بیل ڈالی جا سکے تاکہ مشرقی پاکستان سے گزرنے والے راستے ہندوستان کے لیے کھل جائیں اور کشمیر کا مسئلہ اس طرح حل ہو جائے کہ برصغیر میں مستقبل قریب میں جنگ کا خطرہ نہ رہے، اور امریکہ یکسوئی سے ویت نام کا مسئلہ اپنی مرضی کے مطابق حل کر سکے اور چین کو اس کی حدود میں رہنے کا سبق سکھایا جا سکے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الجزائر سے لے کر پاکستان تک امریکی پالیسی کافی کامیاب رہی۔ مگر اس جنگ نے پاکستانیوں کا طرز فکر بدل دیا۔

جنگ کے بعد سے پاکستان میں سوچ کے دو نمایاں دھارے ابھرے۔ فارغ البال خوشحال طبقہ کی سوچ یہ ہو گئی کہ پاکستان کو چین نواز پالیسی میں بھی کچھ نہیں ملے گا۔ پاکستان ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ خواہ مخواہ بڑی طاقتوں، خاص طور پر امریکہ کو ناراض کر کے اقتصادی امداد بند کروا کے اپنے آپ کو مزید کمزور کر لے گا۔ اس طبقے کا خیال یہ ہے کہ عالمی صف آرائی میں امریکہ اور چین کی اگر جنگ بھی ہو جائے۔ جیسا کہ ویت نام میں امریکہ کے جنگی پروگرام کے نتیجے میں اغلب ہے۔ تو امریکہ ویت نام سے بہت دور ہے اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوگا۔ البتہ چین کافی کمزور ہو جائے گا۔ اور پھر کسی اور ملک کی اقتصادی یا فوجی مدد کے قابل نہیں رہے گا۔ لہٰذا امریکہ سے بگاڑنا غلط پالیسی ہے۔

دوسرا طبقہ عوام الناس پر مشتمل ہے جس کی سوچ یہ ہے کہ آخر پاکستان کو اپنی اعلیٰ فوجی کارکردگی کے باوجود ۶ ستمبر کی جنگ میں شکست کیوں قبول کرنی پڑی۔ اس کا جواب بظاہر یہ دیا گیا ہے کہ پاکستان کے پاس فوج اور جنگی سامان کافی نہ تھا اور وہ اس لیے نہ تھا کہ پاکستان ایک چھوٹا ملک ہونے کی وجہ سے اقتصادی لحاظ سے اتنا کمزور ہے کہ ہندوستان کے مقابلے کے لیے فوج تیار ہی نہیں کر سکتا۔ اس جواب کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں میں مسئلے کی سیاسی نوعیت کو اقتصادی نوعیت سے بدلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیا پاکستان بغیر کسی بنیادی اقتصادی تبدیلی کے اس قابل ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی ایک اور ریاست بننے سے بچ جائے اور اگر ۱۸ سال بعد بھارت کی ایک اور ریاست ہی بننا تھا تو پاکستان کا نظریہ غلط تھا یا صحیح؟ کیا اقتصادی تبدیلیوں سے پاکستان اتنا طاقتور ہو سکتا

ہے کہ اپنی آزادی برقرار رکھ سکے؟ عوام کے ذہن میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ آزادی کے لیے اعلیٰ فوج اور اعلیٰ سیاسی تنظیم کی ضرورت ہے کیونکہ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ ان ہی دو صلاحیتوں کے بدولت مسلمان ریاست ہندوستان میں قائم رہی اور پاکستان کی صورت میں قائم رہے گی۔ آج ایک مرتبہ پھر برِعظیم جنوبی ایشیا میں مسلم سوسائٹی اس چیلنج سے دوچار ہے جس سے محمد بن قاسم کے بعد اسے سابقہ پڑا تھا۔ اس سلسلے میں اس وقت کے مشرقی پاکستان کے مسائل مغربی پاکستان سے زیادہ الجھے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس جنگ نے دو باتیں مشرقی پاکستان کے بارے میں اور بھی واضح کر دیں ایک یہ کہ مشرقی پاکستان کے چاروں طرف ہندوستان ہی ہندوستان ہے۔ اس جنگ میں جو بے تعلقی مشرقی پاکستان کو مرکز سے محسوس ہوئی وہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ پھر ہمیشہ کہا جاتا تھا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان میں ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہندوستان مشرقی پاکستان پر حملہ کرے تو مغربی پاکستان سے مشرقی پنجاب یا کشمیر پر حملہ کیا جائے گا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اگر مشرقی پاکستان کے دفاع کا مسئلہ نہ ہو تو کشمیر پر فوج کشی کرکے اسے آزاد کرایا جا سکتا ہے۔ مگر اس جنگ نے بظاہر یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان کے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ جارحانہ لڑائی لڑ سکے۔ اگر پاکستان کی مسلح افواج مغربی حصے میں بھی جارحانہ طاقت سے بہرہ ور نہیں تو مشرقی پاکستان کا دفاع کیا کر سکے گا؟ چھ ستمبر کی جنگ میں مشرقی پاکستان پر حملہ بھارت نے صرف چین کی فوجی مداخلت کے امکان کی وجہ سے نہیں کیا۔ لہٰذا مشرقی پاکستان کی بے چینی جائز ہے کہ اگر ہندوستان مشرقی پاکستان پر حملہ کر دے تو اس کے پاس کم از کم اتنی دفاعی طاقت ضرور ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی آزادی برقرار رکھ سکے کیونکہ لازم نہیں کہ چین ہمیشہ اس کی مدد کو پہنچ سکے۔

یہاں جارحانہ اور دفاعی طاقت کی تعریف کر دینی ضروری ہے۔
جارحانہ طاقت سے مراد کسی ریاست کی وہ طاقت ہے جس کے بل بوتے وہ اپنی مرضی دوسری ریاستوں سے منوا سکے، جبکہ دفاعی طاقت کسی ریاست کی اس قابلیت کا نام ہے جس کی بدولت وہ کسی دوسری ریاست کی مرضی سے جو اس کے مفاد کے خلاف ہو اپنے آپ کو بچا سکے۔

چھ ستمبر کی جنگ اور معاہدہ تاشقند نے یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان کے پاس اپنے دونوں حصوں کی حفاظت کے لیے نہ جارحانہ طاقت ہے اور نہ دفاعی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دونوں طاقتیں نہیں تو کیا کوئی غیر فوجی ایسی رکاوٹ ہے جو بھارت کو پاکستان کے خلاف اپنی من مانی کرنے سے روک سکے۔ غیر فوجی رکاوٹ non-military deterrent سے مراد وہ اہلیت ہے جس کی مدد سے کوئی ریاست جارح ریاست کے پیدا کردہ چیلنج کا ایسا جواز پیش کر سکے کہ وہ ریاست از خود ہی اپنی بات منوانے سے باز رہے۔ یہ غیر فوجی رکاوٹ پاکستان نے چین سے دوستی کے ذریعے پیدا کی تھی اور پاکستان کے لوگوں کو بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ چھ ستمبر کی جنگ میں چین کی مدد نے انہیں کس طرح بچایا۔ مشرقی پاکستان کے اس شعور کو بہت غلط انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مشرقی حصے کے پاکستانیوں نے ہندو اور انگریز دونوں کے ہاتھوں سے مغربی پاکستان کے لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تکالیف سہی تھیں۔ انگریز سامراجیت کے تلخ ترین واقعات بنگال میں پیش آئے۔ دراصل ان کی اصل مشکل کے حل کی جانب ۱۹۶۵ء تک توجہ ہی نہیں دی گئی۔

پاکستان بنانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمان ہندوؤں کے اقتصادی غلبے سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ مگر ہوا یہ کہ ہندو صنعت کار کی جگہ مسلمان صنعت کار نے لے لی، جو چند وجوہات کی بنا پر یا تو مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے یا بمبئی، بہار یا یو۔پی کے مہاجرین تھے جو تقسیم ہند کے بعد مشرقی پاکستان میں جا کر آباد ہو گئے تھے لہٰذا وہاں اقتصادی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ آسکی اور یہی وجہ تھی کہ عام آدمی نے اپنی زندگی میں کوئی فرق محسوس نہ کیا جس مقصد کے لیے لوگوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا، وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان اقتصادی لحاظ سے اتنا کمزور تھا کہ اپنا دفاع خود نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا رہا کہ پاکستان نے گزشتہ دس سالوں میں اتنی ترقی کر لی تھی کہ دوسرے ترقی پذیر ممالک اس پر رشک کرنے لگے تھے۔ لیکن آج تک یہ کسی نے نہیں پوچھا کہ آخر وہ ترقی جو نہ کسی حملے کے وقت ہمارے کام آسکی اور نہ ہمارے عوام کی بود و باش میں کوئی بہتری پیدا کر سکی، وہ کیسی ترقی تھی؟

امریکہ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے جو نتائج حاصل کرنا چاہتا تھا اس میں کلی طور پر کامیاب نہ ہو سکا چنانچہ پاک بھارت جنگ جاری رکھنا پڑی۔ یہ جنگ اپنے تمام ممکنہ عوامل کے ساتھ جاری رہی اور بالآخر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں اپنے منطقی انجام تک پہنچی۔

بہرحال یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہنری کسنجر جولائی ۱۹۷۱ء میں ایک خفیہ دورے پر چین گیا۔ پھر صدر رچرڈ نکسن نے بھی فروری ۱۹۷۲ء

بقیہ صفحہ ۶۱ پر